

Meri Barbadi Ka Noha

[اپنی بد نامی کا سہرا میرے ہی سر ہے نہ میں نادانی میں محبت کرتی اور نہ اپنا سب کچھ لٹا کر اپنی زندگی برباد کرتی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب کافی دنوں سے ہمارے گھر کے سامنے والا مکان خالی تھا اور مالک مکان کسی مختصر فیملی کی تلاش میں تھا۔ جلد ہی اس کو کرائے دار مل گیا۔ یہ کرائے دار رؤف نامی نوجوان لڑکا تھا۔ وہ نزدیکی گائوں سے شہر پڑھنے کے لئے آیا تھا۔ وہ سارا دن باہر رہتا اور رات کو گھر آکر پڑھائی میں مشغول ہو جاتا۔ جلد ہی پاس پڑوس والوں نے محسوس کیا کہ اس کی صحت خراب ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ گائوں سے آیا تھا، سرخ و سفید اور صحت مند تھا، بعد میں رنگت پیلی پڑنے لگی اور دبلا بھی ہوتا گیا۔ ایک روز والد صاحب کو گلی میں ملا۔ انہوں نے پوچھا۔ اسد بیٹے! تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا شہر کا پانی راس نہیں آیا جو روز بہ روز کمزور ہوتے جاتے ہو۔ انکل! دراصل میں صبح شام ہوٹل سے کھانالے کر کھاتا ہوں جبکہ مجھ کو باہر کے کھانے کی عادت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیٹ خراب رہتا ہے۔ والد صاحب بولے۔ اگر تم چاہو تو کھانا ہمارے گھر سے کھا لیا کرو۔ طالب علموں کا بھی معاشرے پر حق ہوتا ہے۔ کھانا تو روز ہی پکتا ہے۔ ایک آدمی کا اس میں سے نکل جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ٹھیک ہے انکل، جب ضرورت ہوئی بتادوں گا۔ اس گفتگو کے اگلے روز ہی معلوم ہوا کہ اسد اسپتال میں داخل ہے۔ کسی غیر معیاری ہوٹل سے کھانا کھایا تو فوڈ پوائزننگ ہو گئی۔ کالج میں طبیعت خراب ہو گئی۔ کالج والوں ہی اسپتال لے گئے۔ چپڑا اسی کو پیغام دے کر اسد نے ہمارے گھر بھجوا دیا تھا کہ میں فلاں اسپتال میں داخل ہوں۔ میرے گھر سے اگر کوئی آجائے تو ان کو بتادیجئے گا۔ شاید انہی دنوں اس کے گھر سے اس کا بھائی یا کوئی رشتہ دار آنے والا تھا تبھی اس نے یہ سند یہ میرے والد کو بھیجا تھا۔ والد صاحب، اسد کی عیادت کو اسپتال گئے۔ وہ وہاں پانچ دن داخل رہا۔ اس دن کے بعد سے اس کے لئے ایک ٹائم کا کھانا ہمارے گھر سے جاتا۔ جب وہ کالج سے آجاتا تو بیل بچا دیتا، ملازم اس کو کھانے آتا۔ اسد نے بہت اصرار کیا کہ وہ کھانے کی رقم ہر ماہ دیا کرے گا لیکن والد صاحب نے منع کر دیا کہ کوئی بات نہیں، ہمسایوں کا بھی حق ہوتا ہے۔ کچھ دن بعد ہمارا ملازم چھٹی پر چلا گیا۔ والد صاحب تو دکان پر ہوتے تھے لہذا اب اسد کو کھانا پہنچانے کا مسئلہ تھا۔ میرا بھائی دبی میں تھا اور گھر میں ایک چھوٹی بہن تھی جو مجھ سے صرف دو سال چھوٹی تھی۔ اس نے تو صاف منع کر دیا کہ وہ کھانا پہنچانے اسد کے گھر نہیں جائے گی اور والدہ نہیں چاہتی تھیں کہ اسد روزانہ ہمارے گھر میں کھانا کھائے آئے کیونکہ اس طرح لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل جاتا۔ اب اس کا یہی حال تھا کہ جب وہ کالج سے آتا، بیل دے کر دروازے پر کھڑا رہتا اور کھانالے کر اپنے گھر چلا جاتا۔ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ برتن دینے آتا، بیل دیتا اور ہم برتن لے لیتے۔ بظاہر یہ آسان کام مگر خاصا مشکل تھا۔ کبھی امی فارغ نہ ہوتیں تو یہ فرض مجھ کو ہی انجام دینا پڑتا۔ ایک روز وہ کھانا لینے نہ آیا، اگلے روز بھی نہ آیا امی برقع اوڑھ اس کے دروازے پر گئیں۔ بیل دی وہ باہر آیا تو پوچھا۔ بیٹا! کھانا کیوں نہیں لے رہے؟ کہنے لگا۔ خالہ جی! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بخار آ رہا ہے اور مجھ کو اسپتال کی بھی تکلیف ہو گئی ہے۔ اچھا بیٹا! تو میں کھچڑی بنوا کر بھیج دیتی ہوں۔ امی نے مجھ سے کہا کہ کھچڑی بنادو۔ میں نے کھچڑی تیار کر لی تو خالہ کا فون آ گیا کہ ان کے شوہر کی طبیعت خراب ہے اور ان کو اسپتال لے گئے ہیں۔ فوراً جانو۔ والدہ نے برقع سر پر ڈالا اور خالہ کے گھر جانے نکل گئیں۔ ان کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اسد کو کھچڑی دینی ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے ہی ہمت کی۔ چادر لپیٹ میں کھچڑی لے اس کے دروازے پر پہنچی۔ بیل دی، کوئی جواب نہ آیا سوچا شاید اسد کی طبیعت زیادہ خراب ہے، سو ہمت کر کے اس کے گھر کے اندر چلی گئی کیونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دبے قدموں ڈرتی ڈرتی آگے بڑھی۔ وہ کمرے میں نہ تھا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز سنی۔ کھچڑی اس کے کمرے میں پڑی ٹیبل پر رکھ کر میں الٹے قدموں لوٹی تو وہ واش روم سے نکل آیا۔ کہنے لگا۔ آپ کو زحمت کرنا پڑی شکر یہ۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، اماں کو خالہ کے یہاں جانا پڑ گیا تبھی میں آگئی۔ اچھا برتن لیتی جا رہی تھی۔ اس نے پلیٹ میں کھچڑی نکالی برتن خالی کر دیے۔ میں نے برتن اٹھائے اور گھر کو آگئی۔ اس پہلی جرات کے بعد میری جھجک ختم ہو گئی۔ اب جب بھی ہیں فارغ ہوتی، دروازے سے جھانکتی، اگر کوئی گلی میں ادھر ادھر نہ ہوتا تو تیزی سے اس کے گھر کے اندر چلی جاتی اور کھانادے کر آ جاتی۔ شروع میں ہم سلام و دعا کے سوا اور کوئی بات نہ کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ حجاب کم ہونے لگا اور میں ٹھہر کر اس کے ساتھ تھوڑی دیر کوئی ادھر ادھر کی باتیں کر لیا کرتی تھی۔ ابھی تک محلے والوں کو علم نہ تھا کہ میں اسے کھانا پہنچاتی ہوں۔ ایک روز بد قسمتی سے محلے کی ایک عورت نے مجھ کو اسد کے گھر سے نکلتے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا، بات منہ سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔ وہ ایک لگائی بچھائی کرنے والی عورت تھی، ہر طرف اس بات کو پھیلا دیا اور یوں سارے محلے میں ہنسا ہو گئی۔ ماں نے اسکول سے اٹھالیا اور اس ڈر سے گھر سے میرا باہر نکلتا بند کرادیا کہ کہیں اس معاملے کی خبر میرے والد کو نہ ہو جائے۔ اب تک تو ہمارے درمیان کوئی ایسا ویسا معاملہ نہ تھا لیکن پابندی لگی تو نجانے کیوں دل کو بے کلی رہنے لگی۔ محسوس ہوا کہ میرے دل میں اس کی جگہ تھی جو اب اس کی جدائی مجھے تڑپانے لگی تھی۔ انسان پر پابندیاں لگ جائیں تو کرب کی شدت بھی دو چند ہو جاتی ہے۔ اب میں اس سے ملنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگی۔ ایک بار خط لکھ کر اس کے گھر کے اندر پھینک دیا جس میں لکھا تھا کہ گلی میں نکل کر اپنی صورت دکھا دیا کریں کہیں تو پل بھر کو ملو۔ اس نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھ کو اور زیادہ بے قراری لگی۔ ایک اور خط لکھ کر دروازے سے جھانکا۔ دیکھا کہ گلی میں کوئی نہیں ہے تو تیز قدموں سے اس کے گھر کی طرف گئی۔ اس کے مکان کی وہ کھڑکی جو صحن میں کھلتی تھی، وہ کھلی ہوئی تھی۔ ہاتھ آگے کر کے خط صحن میں پھینک کر الٹے قدموں گھر میں گھس آئی۔ اب اسد کو یقین ہو گیا کہ جب تک وہ مجھ کو جواب نہ دے گا، میں اسی طرح احمقانہ حرکتیں کرتی رہوں گی۔ سو اگلے روز اس نے دو پہر کے بعد ہماری بیل بچائی۔ امی نماز پڑھ رہی تھیں، میری چھٹی حس نے کہا، ہو نہ ہو ہے۔ دبے قدموں دروازے پر پہنچی، جھانکا تو وہی تھا۔ کہنے لگا۔ میرے مکان میں میرے کالج کے دوست اور کلاس فیلو بھی آجاتے ہیں لہذا اب تم میرے گھر میں مت آنا۔ تو پھر گلی میں ہی میری بات سن لو۔ آخر تم نے مجھ سے کیا بات کرنی ہے، ابھی کہہ دو۔ ابھی ابا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے، وہ اچانک آگئے تو؟ تم مجھ سے دریا پر ملو۔ میری سبیلی کا گھر وہاں قریب ہے، میں اس کے گھر کا کہہ کر جاؤں گی۔ دن کو تو مجھے پڑھائی کرنا ہوتی ہے، کل سے امتحان شروع ہیں۔ اچھا تو پھر رات کو مل لو۔ رات کو....! اس نے حیرانی سے کہا۔ ہاں! دریا و چار قدم پر تو ہے۔ رات گوامی، ۱۱ بجدی سو جاتے ہیں، میں اندھیرے میں نکل کر دریا پر آ جاؤں گی۔ دیکھو آج رات ضرور آنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم نہ آؤ اور میں وہاں تمہارے انتظار میں رات بھر بیٹھی رہ جاؤں۔ ایسا کہہ کر میں نے جلدی سے دروازہ بند کر

انتظار دیا۔ اب رکوف کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہ گیا کہ وہ رات کو دریا کنارے جا کر بیٹھ جائے اور میرا کرے۔ اتفاق کہ اس روز اماں اور ابا پر تک باتیں کرتے رہے اور کہیں بارہ بجے تک سوئے۔ جونہی وہ سوئے، میں نے دیے قدموں محن عبور کیا اور ابستہ سے کٹدی کھول کلی میں جھانکا۔ آسمان پر ستاروں کی مدھم روشنی تھی۔ گلی سنسان تھی اور وہاں دور دور تک کوئی نہ تھا۔ جانے دل کی گلی کا کیا زور اور جذبہ ہوتا ہے کہ انسان نہ اندھی دیکھتا ہے اور نہ طوفان، انسانوں کا خوف رہتا ہے اور نہ بھوت پریت کا! تیز تیز قدم اٹھاتی تقریباً سات منٹ میں دریا کنارے جا پہنچی۔ اگرچہ مجھے آنے میں دیر ہو گئی تھی تو کبھی یقین تھا کہ وہ وہاں ضرور ہو گا۔ ہزاروں وسوسوں کا خوف دل پر اٹھائے جب میں دریا تک پہنچی تو دیکھا کہ وہاں وہ نہ تھا تو تھوڑا سا اور آگے بڑھی تو کوئی بیٹھا نظر آ گیا۔ میں سمجھی اسد ہے جو میرا انتظار کر رہا ہے۔ جب ذرا اور آگے گئی تو کیا دیکھا کہ وہاں وہ تو نہیں، کوئی اور بیٹھا ہے۔ میں ڈر کر واپس پلٹنے لگی تو وہ بولا۔ ڈرو نہیں بھنا، مجھے اسد نے بھیجا ہے۔ اس کو سخت بخار ہے، وہ میرے گھر میں لیٹا ہے، تم کو بلا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ رات آدھی ہو چکی ہے، اب تمہارے گھر گئی تو واپس اپنے گھر کب پہنچو گی؟ میرا اگر زیادہ دور نہیں ہے اب آگئی ہو تو اس کی بات سن لو۔ یہ لو اس نے پرچہ لکھ کر مجھے دیا ہے، خود پڑھ لو، اگر میری بات کا یقین نہیں ہے۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور پرچہ پر ڈالی۔ میں نے پڑھا۔ لکھا تھا، مجھ کو شدید بخار ہے، دو گھڑی دیکھنے کو آ جاؤ۔ انداز تحریر اسی کا تھا۔ میں اس کی تکلیف کا سوچ کر تڑپ اٹھی۔ بغیر سوچے سمجھے اس کے دوست کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ذرا آگے آئے تو اسکوٹر نظر آیا۔ وہ بولا۔ اس پر بیٹھ جاؤ، بس دھمٹ بھی پہنچ جائیں گے، تم کو واپس بھی اسی سواری پر لے آؤں گا۔ نہ جانے کدھر کس راستے وہ مجھے لے چلا۔ اس وقت میری مت ماری گئی تھی۔ اسد کے بخار کا سن کر اس کے پیچھے چل دی حالانکہ مجھے واپس گھر کو پلٹ جانا چاہیے تھا۔ اسد کی سوچوں میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ اندازہ نہ ہوا کتنی دور چلی آئی ہوں۔ جب ایک مکان کے سامنے اسکوٹر روک کر اس نے اترنے کا کہا تو مجھے ہوش آیا۔ اب میں کلی طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی۔ مکان کے اندر پہلا قدم رکھنے ہی دل نے کہا کہ تم نے یہاں آ کر بڑی غلطی کی ہے۔ دھڑکنے دل کے ساتھ آدھی رات کو میں ایک انجانے گھر میں داخل ہو گئی۔ تصور میں اسد کا پیار چہرہ تھا اور کچھ سوچ نہ تھی۔ جب اندر گئی وہاں بستر ضرور بچھا تھا مگر اس پر اسد نہ تھا۔ ادھر ادھر دیکھا شاید دوسرے کمرے میں ہو۔ ابھی میں جائزہ لے رہی تھی کہ دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ وہ شخص جو مجھے لایا تھا، دروازہ بند کر چکا تھا۔ اتنے میں دوسرے کمرے سے دواور آدمی بھی آگئے مگر ان میں کوئی اسد نہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ اسد کہاں ہے؟ ان میں سے ایک بولا۔ اسے بھول جاؤ، وہ دریا میں ڈوب چکا ہے، اب ہم ہیں تمہارے اسد۔ اس کے بعد کیا کہوں، قلم تو خون کے انسونوں میں ڈبو کر لکھوں تو سارے بدن کا لہو کام آ جائے گا۔ میں کتنی بے بس لڑکی اور یہ انسان نمادرندے... جو قدم بنا سوچے سمجھے اٹھایا، وہ مجھے کس راہ لے آیا۔ رات سر پر سے ایسے گزری جیسے ڈائن ہو، ہزاروں گدھ اور چیلین چلاتی ہوئی کانوں میں محسوس ہورہی تھیں۔ صبح ہوئی بھی تو کتنی سیابیائیں سمٹ کر میرے دامن میں لے آئی، اچا! الا تو پھر ہواہی نہیں۔ میں نے اگر ایک غلطی کر لی تھی تو دوسری نہیں کرنی تھی مگر اگلی سب سے بڑی غلطی یہ کہ ابا کے خوف سے صبح گھر پہنچنے کی کوئی تدبیر نہ کی۔ حالانکہ میں چاہتی تو صبح گھر چلی جاتی۔ جو بو تا سو ہوتا، بابل کی چھت سے تو نہ جاتی مگر میں تو وہیں بیٹھی روتی رہی۔ اسد کو کوستی رہی کہ اس نے یہ سب کچھ میرے ساتھ جان بوجہ کر کیا تھا یا وہ خود کسی کا شکار ہو گیا تھا۔ بھولپن سے اپنے کسی دوست کو اپنا راز دار بنا کر ان کو موقع فراہم کیا تھا۔ یہ عقدہ تو کبھی کھل ہی نہ سکا۔ گھر جاتی تو یہ عقدہ کھلتا لیکن گھر کس منہ سے جاتی، میری حالت، میری بادی کا نوحہ تھی، بھلا کون مجھے قبول کرتا۔ شاید ابا جان مجھ کو دیکھتے ہی شوٹ کر دیتے۔ دو پہر تک میں روتی رہی۔ وہ لوگ گھر کو تالا گا کر چلے گئے۔ میں نے پاس پڑوس میں جھانکا اور نہ شور مچایا۔ یہی جی چاہا کہ اپنی بدنامی کا سہرا اگانے سے بہتر ہے کہ یہیں پیاسی دفن ہو جاؤں۔ شام کو وہ لوگ آگئے۔ کہا کہ یہاں رکنٹھیک نہیں، کسی نے پولیس کو اطلاع کر دی ہے۔ ان کے ہتھے چڑھ گئے تو اخباروں میں تصویر آجائے گی، بہتر ہے نکل چلو۔ انہوں نے نہ تو مجھے اسد تک پہنچایا اور نہ میرے گھر تک، بلکہ ایک کار میں لاہور لے آئے اور یہاں شاہی محلے میں ایک عورت کے گھر پر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس عورت نے مجھے ولا ساد یا۔ وہ کہتی کہ مجھے ماں سمجھو مگر وہاں نہیں، ماں کے نام پر دھبہ تھی۔ وہ مجھے بھرا کہ کر متعارف کراتی تھی۔ نجانے کب تک یہ بھرا اس گندی جگہ پر بکتا کہ ایک روز ایک شخص جو وہاں اپنا دل خوش کرنے آیا تھا۔ میں نے اسے اپنا قصہ سنا کر التجا کی کہ مجھ کو میرے والدین تک پہنچادو، بے شک وہ مجھے شوٹ کر دیں، اس جگہ رہنے سے تو باپ کے ہاتھوں مر جانا بہتر ہے۔ اس آدمی کو ترس آیا اور اس نے مجھے میرے گھر تک پہنچادیا وہاں سب بدل چکا تھا ماں میری یاد میں رو رو کر اندھی ہو چکی تھی باپ یہ بے عزتی نہ سکا اور دنیا سے ہی رخصت ہو گیا بھائی نے دروازہ تو کھولا لیکن کوئی بھی تعلق رکھنے سے انکار کر دیا۔ وہی آدمی مجھے واپس اپنے ساتھ لے آیا۔ میرے سے نکاح کیا اور میں اب اس کی بچے کی ماں بننے والی ہوں پر زندگی میں ایک غلطی مجھے گناہ کی ایک ایسی گار میں لے گئی جہاں صرف دلدل ہے دلدل تھی مجھے میرے شوہر نے کوئی بھی طعنہ نہیں دیا لیکن ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ یہ میرا آخری ٹھکانہ ہ بھی کہ نہیں؟]